آتا ہے ۔ لیکن "بارکلے " BERKELEY پیدائش ۱۶۵۸ء وفات ۱۷۵۳ء مشہور فلسفی فرماتے ہیں کہ یہ تمام موجودات ذہنی تصورات میں اور ذہن سے باہر کسی چیز کا وجود نہیں ہے[1] اس سے ثابت ہوا کہ ہم تصورات ہی کھاتے پیتے ہیں، کیونکہ جن چیزوں کا خارج میں مشاہدہ کیا جاتا ہے ۔ (سورج، چاند، ستارے، دریا، پہاڑ وغیرہ) سب کے سب محض فریب اور دھوکہ ہوں گے ۔

(ج) ۔ منطق و فلسفہ کی کتب میں یہ مسئلہ موجود ہے کہ " تناقض محال" ہے، لیکن دور جدید کے مشہور فلسفی "ہیگل" پیدائش ۱۷۷۰ء وفات ۱۸۳۱ء کی عقل ہر انداز میں یہ ثابت کرتی ہے کہ " تناقض نہ صرف ممکن ہے بلکہ بکثرت پایا جاتا ہے حتیٰ کہ تمام کائنات کا وجود محض تناقض پر مبنی ہے"[2]

عقل کے بارہ میں صرف اتنی عرض کرنی ہے کہ خدا اور ہماری عقل میں افضل کون ہے، آپ خود ہی بتائیں، کہ خدا کو چھوڑ کر عقل کو پوجنا یہ شرک کیسے جائز قرار پا سکتا ہے ۔

مندرجہ بالا حقائق سے روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ عقل کبھی بھی کسی صورت میں معیار زندگی نہیں بن سکتا، البتہ اس کی اس حقیقت سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ مذہب و زندگی کے معاملات میں اس کی خدمات کچھ کم نہیں اسی عقل ہی نے کارسازی کو دیکھ کر کارساز کا پتہ دیا، عمل کو دیکھ کر عامل کی تحقیق کی اور عمارت کو دیکھ کر معمار پر استدلال کیا، اسی طرح بے شمار مظاہر قدرت کا مشاہدہ کر کے قادر مطلق اور ما فوق الفطرت ہستی (خدا) کا سراغ لگانے میں بڑی حد تک کوشش کی ہے، لیکن ان خوبیوں کو مدنظر رکھ کر معیار زندگی ہرگز تسلیم نہیں کیا جا سکتا، ورنہ نزول کتب سماویہ اور ارسال انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام بے فائدہ ہوگا، حالانکہ فعل الحکیم لایخلو عن الحکمۃ ۔

دلائل عقلی

(۱) ہر شخص فطری طور پر متمدن پیدا کیا گیا ہے، اور مدنیت اس کے خمیر میں داخل ہے، جانوروں کی طرح الگ الگ زندگی نہیں بسر کرنا چاہتا بلکہ مل جل کر رہتا ہے، ایک حیوان تو اپنی ضروریات زندگی علیحدگی میں حاصل کر سکتا ہے مگر انسان اپنی غذا، لباس تنہا نہیں حاصل کر سکتا، اس لئے یہ ایک دوسرے سے مل جل کر رہنے میں فطرۃً مجبور ہے، پھر انسان میں فطری طور جذبات، جنسی میلانات کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ الفت و محبت اور نفرت موجود ہے، ایک دیہاتی مثل ہے کہ دو برتن ہوں تو وہ بھی کھڑکتے ہیں، اس لئے انسان میں اجتماعی زندگی کی بنا پر باہم تکرار، نزاع چپقلش وغیرہ کا ہونا ضروری ہے، تو زندگی کے اس موقعہ پر ان تمام امور کی اصلاح و فلاح کے لئے چند قوانین درکار ہیں، جو کہ دنیا بھر میں امن و امان، راحت و سکون کی زندگی قائم کریں؛ اور یہ امن و امان مذہب کے سوا اور کسی طریقہ سے قائم نہیں ہو سکتا، اس لئے

---

[1] تاریخ فلسفہ مصنفہ الفرد ویبر۔ [2] تاریخ فلسفہ جدید ص۲۲۳ ۔

یہ فطری صورت مذہب حق کی اتباع کے لئے انسان کو مجبور کرتی ہے۔

سوال :۔ امن وامان اور سکون قائم کرنا اور زندگی کے انتظامات کرنا حکومت کا کام ہے، مذہب کی اتباع تو پھر بھی ضروری نہیں ؟

جواب :۔ مذہب ابدی صداقتوں کو بتاتا ہے، جو کہ انسانی فطرت کے ہم آہنگ ہوتی ہے، اگر کوئی حکومت ان صداقتوں کا نفاذ کرتی ہے، تو کامیاب رہتی ہے، مگر ان سے ہٹ کر تنہا عقل انسانی پر بھروسہ کر کے جب کوئی حکومت قدم اٹھاتی ہے تو وہ امن وامان تو کیا قائم کر سکتی ہے، البتہ چنگیز و ہلاکو اور ہٹلر و مسولینی کی یاد ضرور تازہ کر دیتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حکومت و پولیس بھی مکمل امن وامان قائم نہیں کر سکتی اور نہ ہی کوئی امکان ہے، کیونکہ حکومت نے تو ان امور کی اصلاح کرنی ہے جو ظاہر ہیں یا جن کا علم ہو جاوے، خفیہ امور کی اصلاح تو ناممکن ہے، البتہ یہ قوت صرف مذہب ہی کو حاصل ہے کہ جو خفیہ اور ظاہری حالات کی بیک وقت اصلاح کا ضامن ہے، اور اس کی پابندی سے یہ امن وامان قائم ہو سکتا ہے۔

چنانچہ تمام دنیا کی قوموں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے، آپ نے یہ سنا ہو گا کہ تقریباً ہر حکومت نے اس کا انتظام کیا ہے کہ جیل خانوں میں کوئی مذہبی آدمی جا کر قیدیوں کی مذہبی حیثیت سے تمام بدکرداریوں کی برائی بیان کرے، عذابات الٰہی سے ڈرا کر خدا تعالیٰ کی واقفیت کرائی جائے، یہ اصلاحی پروگرام کم سے کم ہفتہ وار تو ضرور بنائے جاتے ہیں۔

اس حقیقت سے پتہ چلا کہ حکومت بھی انسانی امور کی اصلاح کرنے سے قاصر ہے، الغرض ۔ مذہب ہی کی ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو کہ ہر کسی کے حقوق، جان و مال اور آبرو کی حفاظت کرتا ہے۔

(۲) ہر چیز سے ظاہر اور باطنا اچھائی و برائی کا تعلق ہے، پھر موقع محل کے اعتبار سے ایک چیز ایک جگہ بھلی و حسین ہے، وہی چیز دوسری جگہ بری اور قبیح ہے، مگر ان صورتوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک حد مقرر کر رکھی ہے، کہ ایک انچ آگے پیچھے ہونا اس کے حسن کو قبیح سے بدل دیتا ہے، مثلاً غذا کا استعمال تمام مصالح و اغراض لذت اور راحت پر مشتمل ہے، اور یہ بقاء حیات کا ایک سبب ہے، لیکن اسکی بھی ایک حد مقرر ہے، جو اس حد سے بڑھ کر زیادہ کھالے وہ ہیضہ میں مبتلا ہو کر آخر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، اسی طرح ہر بات کی اچھائی و برائی کی ایک لطیف و نازک حد مقرر ہے، اور بہت جگہ وہ انسانی علم میں بہت مشکل سے آتی ہے، اور بعض کے علم میں آتی ہی نہیں تو آخر اس فطری تقاضا کے لئے ان حدوں کا علم اور ان کی نگہداشت لازمی ہے۔ ان تمام حدود کی خبر گیری کرنے والا صرف مذہب ہی ہے، اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔

(۳) ہر انسان اپنے اشرف المخلوقات ہونے کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتا، اس وقت جتنی بھی مخلوق ہے، غرضیکہ ملائکہ وغیرہ ان تمام سے انسان کا مرتبہ زیادہ ہے۔ اور یہ تمام مخلوق انسان کے لئے بنائی گئی ہے۔ اگر ان (ربانی، جمادات، حیوانات،

نباتات وغیرہ) میں سے ایک قسم نہ ہو تو کیا انسان کا وجود باقی رہ سکتا ہے، پانی اگر نہ ہوتا تو زندگی کیسے گزر سکتی تھی یہ غذائیں غلہ جات، پھل عالم میں نہ ہوتے نیز یہ زمین و آسمان، چاند، سورج، ستارے نہ ہوتے تو کوئی چیز بھی پیدا نہ ہو سکتی، اور پھر کیسے پک سکتی تھی، غرضیکہ دنیا بھر کی تمام موجودات (جمادات، نباتات، حیوانات وغیرہ) میں سے کچھ نہ ہوتے، اور کچھ ہوتے تو بھی انسانی زندگی گزارنی تلخ ہو جاتی، بلکہ اب بھی اگر کوئی چیز عالم میں نیست و نابود ہو جاوے، یا صرف ایک ہی نوع غائب ہو جاوے تو ہماری زندگی میں کتنا خلل واقع ہو جائے گا، معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ساری موجودات ہمارے لئے پیدا کی ہیں، تو جب یہ تمام چیزیں انسان کو دے کر اشرف المخلوقات کا خطاب دیا گیا ہے تو کیا یہ انسان بھی کسی کے لئے ہے یا نہیں؟ ذرا غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انسان صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، اس لئے کہ جیسے انسان تمام مخلوقات سے اعلیٰ ہے، اسی طرح یہ بھی اپنے سے زیادہ کسی اعلیٰ ذات کا ہونا چاہیئے، وہ صرف خدا کی ذات مبارکہ ہی ہے، انسان اللہ تعالیٰ کا اس وقت بن سکتا ہے، جب کہ مذہب حق کی اتباع کرے، اس لئے فطرت، قدرت اور تمام عالم کی انتظام کے قانون سے انسان صرف مذہب حق کے لئے ہے۔

(۴) انسان میں پیدائشی طور پر کچھ قوتیں اور صلاحیتیں رکھی گئی ہیں پھر ان میں کچھ اچھی اور کچھ بری ہیں، رحم، کرم، عدل، انصاف، خوش مزاجی، ایثار و ہمدردی، سخاوت، شجاعت، نرم گفتار و نرم لہجہ، عاجزی و انکساری، دوستوں اور عزیزوں سے محبت وغیرہ یہ تمام اچھی عادات ہیں اور ان کا استعمال بھی عمدہ شمار ہوتا ہے، لیکن ہر موقعہ اور ہر وقت ان کا استعمال عمدہ ہی نہیں بلکہ بسا اوقات بہت ہی برا ہوتا ہے، مثلاً مجرم پر رحم و کرم، ظالموں سے ہمدردی و کرم، موت پر خوش مزاجی اصلاح و سزا میں نرم گفتار و نرم لہجہ، قتل و قتال میں عاجزی و انکساری، ظالم بدکردار فسادی آدمی سے محبت و خاطر مدارات وغیرہ اب کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا استعمال ان تمام مواقع پر عمدہ ہے۔ اور یہ بھی کون کہہ سکتا ہے کہ ہر موقع پر ان کا استعمال برا ہے۔ اس لیئے ضروری ہوا کہ ان مواقع اور اوقات کو معلوم کرنے کے لیئے کوئی قانون ہو جو یہ بتائے کہ کون سی چیز کس وقت بری اور کس وقت اچھی ہے۔ کس وجہ سے اور کس لیئے بری ہے؟ یہ علم اگر ہو سکتا ہے تو وحی الٰہی سے ہو سکتا ہے جس کو دوسرے معنی میں مذہب کہا جاتا ہے۔ اس کے سوا ہر طریقہ دھوکا ہوگا۔

(۵) انسان ایک مخلوق ہے اور اس کا خالق اللہ تعالےٰ ہے۔ یہ بالکل ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہر بنی ہوئی چیز اور بنانے والے میں ایک تعلق ہوتا ہے۔ پھر اس تعلق کے حقوق اور کچھ اصول ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً ہم چند پیسے دے کر مرغی یا بکری خرید کر لیتے ہیں۔ اب یہ ہماری بنائی ہوئی بھی نہیں ہوتی مگر اس پر اپنے حقوق سمجھتے ہیں۔ تو جب مملوک پر مالک کے حقوق، مصنوع پر صانع کے اور مخلوق پر خالق کے حقوق ہیں اور انسان بھی ایک مخلوق ہے، اس پر تو دوسرے حقوق اور اصول ہوں گے۔ باقی رہا یہ کہ وہ حقوق و اصول کیا کیا ہیں۔ حق مذہب کے سوا انسان کو صحیح طور پر اور کوئی نہیں بتا سکتا جو ان حقوق و اصول کا خالق ہے۔ وہی ہر قسم کے حق و قاعدہ کو جانتا ہے۔ وہی ان اصول کو پیدا کرے گا

اور ہر بات کو وہی بتائے گا اور وہی معتبر ہوگی اسی چیز کا نام مذہب ہے۔

(۶) کائنات میں تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ شرف وفضیلت کے مختلف مدارج ہیں۔ مثلاً جمادات، نباتات حیوانات، انسان، ان میں اعلیٰ درجہ باعتبار بزرگی وشرافت صرف مخلوق انسانی کو ہے۔ اور سب سے کم درجہ جمادات کا ہے۔ اس طرح کہ جمادات مثلاً پہاڑ۔ زمین وغیرہ، یہ تمام کم درجہ کی مخلوق ہیں۔ ان میں کسی قسم کی نشو ونما حس وحرکت موجود نہیں۔ جہاں روز اول سے پڑے ہیں وہیں ہیں یا تو ان میں ترقی کے امکانات ہیں اور نہ ہی شعور وحرکت ارادی کی قوت موجود ہے۔ اس لیئے یہ کم درجہ کی مخلوق سمجھے جاتے ہیں۔

نباتات: یہ ایک ایسی مخلوق ہے کہ اس کو جمادات پر فضیلت ہے کیونکہ ان میں جماداتی ہستی کے ساتھ ایک بہت بڑی، مقصدیت مضمر ہے۔ اور وہ نشو ونما اور ارتقائی قوت کا موجود ہونا بہ نسبت جمادات کے کہ وہ اس صفت سے خالی ہیں

حیوانات: اس مخلوق کو پھر نباتات پر شرف وبزرگی ہے۔ کیونکہ ان میں جمادات ونباتات کی نسبت ایک بہت بلند مقصدیت اور جامعیت موجود ہے۔ اور وہ شعور واحساس، حرکت ارادی اور عقل معاش ہے۔ خصوصاً علم الحیوانات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں ایک مکمل نظام حیات موجود ہے۔ مثلاً چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں میں یہ معاشی اجتماعی نظام مکمل طور پر پایا جاتا ہے۔ اور یہ ایک ایسی قوت ہے۔ کہ جو جمادات ونباتات میں نہیں اس سے پتہ چلا کہ حیوانات کو نباتات پر فضیلت ہے۔

انسان: انسان ایک ایسی مخلوق ہے۔ کہ جس کو اشرف المخلوقات کے خطاب سے نوازا گیا ہے اور یہ تمام مخلوقات کے کمالات کا مجموعہ ہے جو کہ اس کی شرف وبزرگی کی اساس ہے۔ اور وہ اس میں ملکیت کا جز، عقل معاد اور فکر عاقبت کا عنصر ہے اس وجہ سے اس میں خالق کی محبت اور اس کی معرفت کا ولولہ پایا جاتا ہے اور یہ ایک ایسی مقصدیت ہے کہ جو انسانی شرف وبزرگی کی ضامن ہے۔ اگر اس وقت حقیقت فراموشی کرکے اور خدا سے منہ موڑ کر حیوانیت کو انسانی مقصد قرار دیا جائے، تو انسانی شرف کا خاتمہ ہو کر رہ جائے گا۔ لہٰذا اس وقت انسان وحیوان میں موازنہ کرنا از حد لازمی ہوگا۔ وہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس میں ملکی جز، عقل معاد اور فکر عاقبت کا عنصر تسلیم کیا جاوے۔ جو اور کسی مخلوق میں نہیں، انہی امور کا تقاضا ہے، محبت الٰہی اور معرفت ربانی اور دین مذہب بھی اسی چیز کا نام ہے پتہ چلا کہ مذہب انسان میں فطرۃً پیدا کیا گیا ہے۔

(۷) ہر جاندار کے لیئے غذا ایک ضروری امر ہے۔ اگر میسر نہ ہو تو ہر جاندار کا وجود ہی ختم ہو جاوے۔ پھر یہ غذا اگر عمدہ ہوگی تو زندگی بھی عمدہ حاصل ہوگی جیسی غذا ویسی زندگی، ہر جاندار کی غذا اس کے مناسب ہوتی ہے انسان کا جسم چونکہ عناصر اربعہ سے بنا ہوا ہے۔ اس لیئے اس کی غذا بھی ایسی ہو جو کہ انہی عناصر سے بنی ہو، یہی وجہ ہے کہ جمادات، نباتات، حیوانات ان تمام سے انسان کی غذا میسر ہوتی ہے جس طرح اسی ظاہری

غذا کا اللہ تعالیٰ نے انتظام کیا ہے۔

اسی طرح جو جوہر کہ انسان میں (روح و دل) جس پر زندگی کا دارو مدار ہے موجود ہے۔ اس کی غذا کا بھی تو لازمی انتظام ہونا چاہئیے اور یہ غذا صرف مذہب ہی سے حاصل ہوسکتی ہے اور کوئی چیز اس باطنی جوہر کو غذا نہیں پہنچاسکتی اگر اس کو غذا باہم نہ پہنچائی جائے تو یہ مرجھاجائے گی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان میں بدی کا جز غالب آجائے گا۔ پھر انسان اپنی انسانیت ہی سے خارج ہوجائے گا، لہٰذا صرف مذہب ہی ایک ایسی غذا بہم پہنچاسکتا ہے۔ جو کہ انسان کو انسانیت میں قائم رکھے۔

(۸) کسی شخص کو کسی چیز کے استعمال کا حق اس وقت حاصل ہوسکتا ہے کہ جب وہ خود بنانے والا ہو، یا ماں باپ سے وراثت میں ملی ہو یا خود کما کر یا ہبہ و صدقہ لے کر اس کا مالک بنا ہو۔ یا فقط استعمال کے لیئے عارضی طور پر کسی سے مانگ لیا ہو یا کسی مالک نے عارضی طور پر استعمال کے لیئے کوئی چیز دے دی ہو۔ اب ہم جو اس دنیا میں موجود ہیں، ایک دو نہیں، ہزاروں اور لاکھوں ایسی چیزیں استعمال کرتے ہیں کہ جو نہ تو ہماری بنائی ہوئی ہیں، نہ ہی وراثہ میں ملی ہیں اور نہ ہی ہم نے کمائی ہیں۔ اور نہ ہمیں کسی نے ہبہ و صدقہ کرکے ان کا مالک بنایا ہے مثلاً آنکھ، ناک، کان، ہاتھ پاؤں دماغ تک تمام حواس اور تمام قوتیں پھر زمین و آسمان، سورج و چاند، ستارے پانی وغیرہ جن کو کہ ہم روزانہ استعمال کرتے ہیں خصوصاً ہوا، اگر ایک منٹ بند ہوجا دے تو زندگی خطرہ میں پڑجا دے، پھر یہ تمام چیزیں بلا قیمت و بلا مشقت آخر ہم ان کو باپ کی جاگیر کی طرح کیوں استعمال کرتے ہیں؟ ہمیں ان پر کون سا حق حاصل ہے؟

ہاں البتہ ایک صورت یہ ہے کہ ہمارے مالک اور ان تمام کے مالک نے ہمیں عارضی طور پر ایک خاص مقصد کے لیئے بھیجا ہے۔ تو ان کے استعمال کی بھی عارضی طور پر اجازت دے دی ہے۔ تا کہ ہم ان سے فائدہ اٹھاتے رہیں اور وہ تمام کام ایسا ہے کہ تمام مخلوق نے اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کیا،

قولہ تعالیٰ :-

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَ أَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ - الآیۃ - پ۲۲ سورۃ احزاب -	ہم نے یہ امانت (یعنی احکام جو بمنزلہ امانت کے ہیں) آسمانوں زمینوں اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی۔ سو انہوں نے اس کی ذمہ داری سے انکار کردیا اور اس سے ڈر گئے، اور انسان اس کو اپنے ذمہ لے لیا۔

وہ کام عبادت اور رضا الٰہی ہے اور اسی کو مذہب کہتے ہیں۔ اگر ہم پوری طرح اس کام میں جس کے لیئے بھیجے گئے ہیں۔ اور مذہب حق کے ہر جز پر عمل پیرا ہوں، تب تو ان تمام چیزوں کے استعمال کا حق حاصل ہے۔

ورنہ ہم سے زیادہ بے غیرت و بے حیا و بے شرم کوئی مخلوق نہیں ہے۔

(۹) انسان کی زندگی میں کچھ مخفی تاریں ایسی ہیں کہ ان کی راہنمائی کے لیئے وجدان و حواس کے علاوہ عقل بھی ناکافی ہے۔ جیسا کہ تجربات و مشاہدات سے ثابت ہے۔ ان کی راہنمائی تنہا وحی الٰہی سے ہی ہو سکتی ہے اور اس پر ہی انسان کی سعادت و شقاوت کا دار و مدار ہے۔ اگر انسان کے تمام اعمال و افعال کی رہنما صرف عقل ہی ہو جاوے تو ان مخفی تاروں کی راہنمائی کس کے حصہ میں آئے گی۔

(۱۰) انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک لطیف المزاج پیدا فرما کر اس کے عین مناسب ہی لطیف غذائیں پیدا فرمائی ہیں۔ لطیف لباس، لطیف مکان، گویا ہر بات میں لطیف لطیف کیفیات کا حامل بنایا ہے۔ نباتات کی غذا مٹی، حیوانات کی گھاس، پرندوں کی غذا دانے، مگر انسان کیلیئے قسم قسم کی لطیف غذائیں پیدا فرمائیں۔

جانوروں کو بالوں کا پرندوں کو پروں کا لباس عطا فرمایا، مگر انسان کے لیئے سوت، ریشم، اون، چمڑہ، ہر طرح کا مال عطا فرمایا، اس کے ساتھ ساتھ انسان کو ایک ایسا جوہر دیا، جو کہ اور کسی مخلوق کو نہیں دیا، اور وہ عقل ہے۔

جب یہ جوہر اعلیٰ ہے، تو یقیناً انسان کا مقصدِ حیات بھی باقی مخلوقات کی نسبت اعلیٰ و افضل ہو گا، جو کہ ان تمام لطافتوں کے دوش بدوش ہو۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ انسان سے بالا و اعلیٰ ذات کون ہے، جس کے کام آجانا یا اس کی اس کی رضا کا حاصل کرنا ہی مقصدِ حیات ہو اور اس مقصد سے ہٹے ہوئے انسان کو گم گشتہ راہ اور بھٹکا ہوا انسان قرار دیا جاوے۔ تو یقینی بات ہے کہ وہ بالا ذات صرف وحدہٗ لاشریک لہ ہے، اس کو کسی کی احتیاج نہیں۔

اب انسان کو اس ذات کی رضا حاصل کرنی ہے۔ اور یہی اس کا مقصدِ حیات ہے۔ جو اس مقصد سے ہٹ گیا وہ انسانیت سے دور ہو گیا، اور جو اس میں کامل اترا وہ انسانیت میں کامل ہو گیا، باقی رہا یہ کہ رضا الٰہی کے طرق عقل سے حاصل ہو سکتے ہیں یا نہ؟ تو یقینی بات ہے کہ عقل اس کام کو سرانجام دینے سے قاصر ہے، کیونکہ ایک انسان کی عقل دوسرے انسانی عقل کی رضا کے اسباب از خود حاصل نہیں کر سکتی تو وہ خدا تعالیٰ کی رضا کے اسباب کیسے حاصل کر سکتی ہے، لہٰذا ثابت ہوا کہ اس کا واحد طریقہ وہی ہو گا، جس کو اللہ تعالیٰ ہی بذریعہ وحی نازل کر کے یا عملی نمونہ بھیج کر صاف صاف واضح کرے۔ یہی وہ مذہب حق ہے جس کی اتباع انسان کو رضا الٰہی کے اسباب سے آشنا کرا سکتی ہے۔ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ۔

مذہب کے متعلق مشہور فلسفیوں کی آراء

(۱) جس طرح فلسفیوں کا ایک گروہ مذہب کو کوئی اہمیت نہیں دیتا، اسی طرح ایک سنجیدہ اور باشعور اور حقیقت پسند گروہ مذہب کو تسلیم کرتا ہے، چنانچہ "رینان" مشہور فلسفی کے نزدیک مذہبی جبلت انسان میں ایک ایسی فطرت ہے جیسے چڑیوں میں گھونسلا بنانا ان کی فطرت میں ہے[1]۔

(۲) "پستانوری" فلسفی نے تو نہایت وثوق کے ساتھ کہا ہے، "کہ نفس انسان کا جوہر مذہبی احساس ہے اور تمدنی زندگی کیلئے مذہب بمنزلہ روح کے ہے[2]۔

(۳) پروفیسر "جیمس" نے کہا ہے "کہ انسان اصولاً بس ایک تقلید کرنے والا حیوان ہے، اس کی ساری تعلیم پذیری بلکہ اس کی ساری تمدنی ترقی کا دارو مدار اس کی اس خصوصیت پر ہے[3]۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا "کہ انسانی سیر و کردار کی کنجی جذبات کے ہاتھ میں ہے، اور عقل تو محض ایک فسرانہ حیثیت سے نگرانی کیا کرتی ہے، پھر چونکہ عقل ارتقائی حیثیت سے جذبات کے مقابلہ میں بہت کم عمر واقع ہوئی ہے، اور خصائص ذہنی کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ صورت ہے، اس لئے جہاں شعور اپنے انتہائی نقطہ کمال سے پست ہوا اور شعور غنی کا دور دورا شروع ہوا بس وہیں عقل کی دوڑ ختم ہو جاتی ہے[4]۔

(۴) مشہور عالم نفسیات پروفیسر جیمز اتچ - لیوبا JAMS H LEUBA نے جنہیں مذہب کی نفسیاتی تحقیق کے بارہ میں اولیت کا شرف حاصل ہے، اپنی ایک فاضلانہ تصنیف[5] میں مذہب کی تعریفات نقل کی ہیں جو کہ مذہب کے کسی نہ کسی جزو پر مزور حاوی ہیں -

الف - مذہب نام ہے اس احساس کا جو کسی مقدس، بالاتر و ماورائے ذات کا وجود انسان کے قلب و دماغ میں پیدا کرتا ہے -

(ب) مذہب نام ہے ایک ازلی و ابدی حقیقت پر ایمان لانے کا جس کی حیثیت اور ارادہ انسانی منشار اور ارادے سے بالاتر ہے، اور جس کا تعلق انسان کی زندگی کے ساتھ بہت گہرا ہے۔ (اس میں ذہنی عقیدہ یا ایمان پر زور دیا گیا ہے) -

(ج) مذہب ایک نفسی اور روحانی حاسہ ہے جس کی بنیاد یہ عقیدہ ہے، کہ انسان اور کائنات میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے -

(د) مذہب ان مافوق الانسانی قوتوں کی رضاجوئی کا نام ہے، جو انسانی زندگی پر حکمراں ہیں - (یہاں عمل و کردار پر زور دیا گیا ہے)

(۵) نفسیات کے مشہور عالم پروفیسر "ینگ" C.G.YUNG نے اپنی زندگی بھر کا تجربہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے

---

[1] معاشرتی نفسیات صفحہ ۸۵ - [2] پستانوری کا فلسفہ تمدن وتعلیم صفحہ ۱۸۵ - [3] پرنسپلز آف سائیکلوجی جلد ۲ صفحہ ۴۰۸ - [4] ایضاً صفحہ ۸ -

[5] GODORMAN مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۳۴ء (از ترجمان القرآن) -

" پچھلے تیس برسوں سے روئے زمین کے تمام متمدن ممالک کے لوگوں نے مجھ سے اپنے نفسیاتی امراض کے سلسلہ میں مشورہ حاصل کرنے کے لئے رجوع کیا ہے .... میرے مریضوں میں نصف آخر میں پہنچنے والے تمام لوگ جو کہ ۳۵ سال کے بعد کہی جا سکتی ہے - کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس کا مسئلہ اپنے آخری تجزیہ میں زندگی کا مذہبی نقطۂ نظر پانے کے سوا کچھ اور ہو یہ کہنا صحیح ہو گا کہ ان میں سے ہر شخص کی بیماری یہ تھی کہ اس نے وہ چیز کھو دی تھی جو کہ موجودہ مذاہب ہر دور میں اپنے پیروں کو دیتے رہے ہیں -

اور ان مریضوں میں سے کوئی بھی اس وقت تک شفایاب نہ ہوسکا جبتک اس نے اپنا مذہبی تصور دوبارہ نہیں پالیا"[1]

(۶) نیو یارک اکیڈمی آف سائنس کے صدر " اے کریسی ، کے یہ الفاظ ہیں -

" ادب و احترام فیاضی ، کردار کی بلندی ، اخلاق ، اعلیٰ خیالات اور وہ سب کچھ جس کو خدائی صفات کہا جا سکتا ہے وہ کبھی الحاد سے پیدا نہیں ہوسکتیں جو کہ دراصل خود بینی کی عجیب و غریب قسم ہے ، جس میں آدمی خود اپنے آپ کو خدا کے مقام پر بٹھا لیتا ہے ، عقیدے اور یقین کے بغیر تہذیب تباہ ہو جائے گی ، نظم بے نظمی میں تبدیل ہو جائے گا ، ضبط و نفس اور اپنے آپ پر کنٹرول کا خاتمہ ہو جائے گا ، اور برائی ہر طرف پھیل جائے گی ، ضرورت ہے کہ ہم خدا پر اپنے یقین کو دوبارہ مضبوط کریں"[2]

(۷) ایک چینی فلسفی KIANG - FOO اپنی کتاب RELIGION IS STRON میں لکھتے ہیں -

زندگی کی ہر منزل پر مذہب ایک قوت ہے - بلا شبہ بچہ پیدائشی طور پر اپنے والدین کی پیروی کرتا ہے ، اسی طرح ایک وقت مذہبی شعور کا عادی بن جاتا ہے "[3]

(۸) " ڈاکٹر رادھا کرشنن " صدر ہندوستان مذہب کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں " کہ انسانی اعمال محض جسم کی موت ختم نہیں ہوتے یہ حقیقت ہے کہ ایک بے گناہ یا مجرم انسان اپنی نیکیوں اور برائیوں کا صلہ ضرور پاتا ہے ..... اور مذاہب انسان کی بنیادی ضرورت کو ایک یقین ، طرز زندگی ، عقیدہ اور جمعیت عطا کر کے روحانی سکون بخشتے ہیں - چنانچہ یہ مذہب ہی ہے جو دنیوی و اخروی زندگی کے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑتا ہے "[4]

(۹) امریکی ڈاکٹر PAUL ERNEST ADIOLRH فرماتے ہیں - " کہ جب میں ڈاکٹری تعلیم ختم کر کے عملاً ڈاکٹری کے کام میں داخل ہوا تو مجھے اپنے اوپر بڑا اعتماد تھا کہ میں زخم اور اس کے اندمال کے طریقوں کو اس حد تک جانتا ہوں کہ میں یقینی طور پر موافق نتیجہ پیدا کر سکتا ہوں ، جب کہ میں اس کے ضروری وسائل مہیا کر کے اس کو استعمال میں لاؤں لیکن جلد ہی میری اس خود اعتمادی کو صدمہ پہنچا ، مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اپنی میڈیکل سائنس میں ایک ایسے عنصر کو نظر انداز کر دیا تھا جو سب سے

---

[1] سائنس اور مذہبی عقیدہ ص۱۱ از سی - اے کاؤلسن [2] مین ڈز ناٹ سٹینڈ الون MAN DOES NOT STAND ALONE ص۱۲۳ [3] پاکستان ٹائمز بتاریخ ۳ مارچ ۶۷ء (پرویز جعہ) - [4] ایسٹرن ریلیجنز اینڈ ویسٹرن تھاٹس ص۶۹ -

زیادہ اہم ہے یعنی خدا "[۱]

(۱۰) مشہور فلسفی " لارڈ رسل " فرماتے ہیں "کہ مذہب ایک ایسا عالمی اصول ہے جو صرف فرائض اور ضابطوں سے روشناس نہیں کراتا ، بلکہ یہ انسان کے باطن کو بھی متاثر کرتا ہے ، اور نہایت ہی مخلص محرک بناتا ہے اور محکم اصول دیتا ہے اور اعلیٰ ترین عزائم سے بہرہ ور کرتا ہے "[۲] تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ۔

اب آپ خود ہی مندرجہ بالا معروضات کا بغور مطالعہ کرنے سے فیصلہ کر سکتے ہیں ، کہ واقعی حق مذہب اور خدائی مذہب کون سا ہو سکتا ہے اور ہر انسان کو فطری تقاضے پورا کرنے کے لئے کون سا مذہب اختیار کرنا چاہیئے ، نظر عمیق سے پتہ چلا کہ وہ صرف خدائی مذہب ہی ہے جس میں پورا کمال حاصل کرنا ضروری ہے ، اور اس سے انحراف کرنا انسانیت کا جنازہ نکالنا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو حق مذہب کی پوری پوری پابندی کی توفیق دیں ، اور اس کی پوری حلاوت نصیب فرمادیں ، اور اللہ تعالےٰ موجودہ دور کے الحاد و زندقہ کے سیلاب سے ہر انسان کو محفوظ فرمادیں ۔ آمین ثم آمین ۔

---

[۱] رسالہ "الحق" نومبر ۱۹۶۶ء ۔ [۲] نیشنل فیچرز (NATIONAL FEATURES) از پاکستان ٹائمز ۳ مارچ بروز جمعہ ۱۹۶۷ء ۔

تبلیغِ دین کی بُنیاد "اَمر بالمعروف و نہی عَنِ المُنکر" ہے

☆ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ○ (اٰلِ عمران)

تم وہ بہترین اُمّت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی۔ تُم لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہو اور بُرائی سے روکتے ہو۔

☆ جامع ترمذیؒ میں حضرت حُذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے؛ رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ارشاد فرمایا:۔

وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهٖ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ أَوْ لَيُوشِكَنَّ اللّٰهُ يَبْعَثُ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْهُ ثُمَّ تَدْعُونَهٗ فَلَا يَسْتَجِيبُ لَكُمْ.

اُس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، تُم ضرُور نیکی کا حُکم کرتے رہو گے اور بُرائی سے روکتے رہو گے، ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی طرف سے عذاب بھیج دے گا پھر تُم اُسے پُکارو گے اور وہ تمھاری دُعا قبول نہ کرے گا۔

مولانا محمد بخش صاحب
شعبہ تبلیغ

اشاعتِ اسلام

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ — نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ

حرف آغاز:-

اسلام نے وجود میں قدم رکھتے ہی جس سرعت اور تیزی کے ساتھ اپنی صداقت کا سکہ بٹھایا اس کی نظیر کوئی دوسرا مذہب پیش نہیں کر سکتا۔ یہ ابتداءً میں عرب کے خشک، بے آب وگیاہ ریگستانی علاقے میں نمودار ہوا اور پھر چند سال کی مدت میں عرب کے اس ریگستانی علاقے سے نکل کر روم وایران کی زبردست بڑی طاقتوں سلطنتوں کو زیر وزبر کر کے رکھ دیا۔ ایک طرف مغرب میں اسلام کا پرچم عظمت لہرا رہا تھا تو دوسری طرف مشرق میں توحید کے نعرے گونج رہے تھے۔ آفتاب کی طرح اس کی روشنی دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ چکی تھی اور آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ مبارک پیشگوئی پوری جس میں آپ نے فرمایا۔

لَا یَبْقٰی عَلٰی ظَهْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ	سطح زمین پر کوئی ایسا گھر یا ہے وہ مٹی کا ہو یا اون کا باقی نہ رہے گا
اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ کَلِمَةَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِیْزٍ	جس میں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو یا عزت والے کی عزت کیساتھ
اَوْ ذُلِّ ذَلِیْلٍ[1]	یا ذلیل کی ذلت کے ساتھ۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے اسباب تھے جن کی وجہ سے اسلام نے مختصر عرصہ میں ترقی کی۔

اسلام کی ترقی کے اسباب:-

وہ اسباب جن کی وجہ سے اسلام نے ترقی کی درج ذیل ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جاوے کہ اسلام کی ترقی کے اسباب صرف انہی میں منحصر ہیں بلکہ اس کے علاوہ اور بھی ہو سکتے ہیں

---

[1] مشکوٰۃ شریف ص۱۶

۱۔ اسلام کی اس قدر حیرت انگیز ترقی کی وجہ یہ تھی کہ اس کے اصول فطرت، اور عقل کے موافق تھے صداقت اور راستبازی کو ساتھ لئے ہوئے عقیدہ اور عمل کے شرک سے بالکل پاک تھے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف ذاتیہ، اخلاق حمیدہ اور طریقہ تعلیم اس قدر اعلیٰ تھے کہ ہر دیکھنے اور سننے والے کا دل موہ لیتے تھے۔ آپ کے چہرہ مبارک پر نظر ڈالتے ہی اسلام کی صداقت اور حقانیت کا یقین ہو جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ جب حضرت ابوذر غفاری رضہ کو آپ کی بعثت، کا علم ہوا تو انہوں نے اپنے بھائی (انیس) سے کہا کہ تم جاکر دیکھو کہ یہ شخص جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اس کی تعلیم و تلقین کیا ہے۔ انیس مکہ آئے اور واپس جاکر بیان کیا

اِنَّہٗ یَعْلَمُ مَکَارِمَ الاَخْلَاقِ — کہ وہ اچھے اخلاق کی تعلیم دیتا ہے

حضرت ابوذر کو اس جواب سے تسلی نہ ہوئی۔ زاد سفر لے کر خود پہنچے اور دربار رسالت میں پہنچ کر دولت اسلام سے مشرف ہوئے[1]۔

اسی طرح طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ عرب کا مشہور شاعر تھا۔ باوجود عرب کی اس کوشش کے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت نہ پہنچنے پائے ایک دفعہ اتفاقیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن مجید پڑھتے ہوئے سنا تو فوراً مسلمان ہو گیا

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خالق و مخلوق کے ساتھ کمال ربط، خالق کائنات کی درگاہ میں کامل عجز کے ساتھ مخلوق کی بے انتہا ہمدردی و دل سوزی اور واحدانیت نہایت دل فریب و مؤثر، یہ وہ امور تھے جو اشاعت اسلام کے سبب بنے چنانچہ عمرو بن عبسہ رضہ سلمی کو جب آپ کی بعثت کا علم ہوا تو مکہ آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی "آپ کون ہیں" آپ نے فرمایا "میں پیغمبر ہوں" انہوں نے کہا "پیغمبر کس کو کہتے ہیں" آپ نے فرمایا "خدا نے مجھے بھیجا" انہوں نے پھر پوچھا کہ "کیا پیغام دے کر بھیجا ہے" آپ نے فرمایا "کہ مجھے یہ پیغام دیکر بھیجا ہے کہ قرابت کا حق ادا کیا جائے، بت توڑے جائیں، خدا کو ایک مانا جائے اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرایا جائے" عمرو نے پوچھا کہ "اس مذہب کے کتنے پیرو کار ہیں" آپ نے ارشاد فرمایا "ایک آزاد (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ) اور ایک غلام (حضرت بلال رضی اللہ)" عمرو نے کہا کہ "میں آپ کی پیروی کرتا ہوں" آپ نے فرمایا کہ ابھی تو یہ ممکن نہیں تم دیکھتے ہو کہ میں کس حال میں ہوں اور لوگوں کا کیا حال میری کامیابی کا جب حال سنو تو میرے پاس آنا" چنانچہ عمرو واپس گئے اور ہجرت کے بعد جب کامیابی کا حال سنا تو حاضر خدمت ہوئے[2]

اسی طرح جبیر بن مطعم رضہ مکہ سے مدینہ منورہ آئے۔ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ آیتیں پڑھ رہے تھے۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْئٍ اَمْ ھُمُ الْخَالِقُوْنَ — کیا وہ بن گئے ہیں آپ ہی آپ یا وہی ہیں بنانے والے یا

---

[1] بخاری و مسلم باب اسلام ابی ذر [2] مسلم باب الاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیہا

أَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ — انہوں نے آسمانوں اور زمین کو بنایا بلکہ بات یہ ہے کہ ان کو یقین نہیں ہے۔

سورہ طور۔ پارہ ۲۷-۴۰

جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے یہ آیتیں سن لیں تو ان کا بیان ہے کہ مجھ کو یوں معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل پرواز کر گیا۔[۱]

۳- اشاعت و ترقی اسلام کے اسباب میں سے تیسرا سبب یہ ہے کہ مسلمان اسلامی اصول اور احکام پر مضبوطی سے قائم رہتے، صدق و یقین کے ساتھ اخلاص کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوتے عبادات و معاملات میں بے انتہا صفائی کے ساتھ چاک و چوبند ہوتے اور حق کے مقابلہ میں مخلوق کی بالکل پرواہ نہ کرتے۔

یہ وہ امور تھے جو خود بخود مجموعی حیثیت سے رشد و ہدایت کا کام دیتے تھے۔ چنانچہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں اور ان کے شب و روز کے طرز عمل سے جس قدر اسلام پھیلا تاریخ کے اوراق ان سے لبریز اور اس پر ببانگ دہل شہادت دے رہے ہیں۔

اشاعت اسلام پر مستشرقین کا اعتراض:-

اسلام کے اس عروج و ارتقاء اور بے مثال ترقی و اشاعت کو دیکھ کر یورپ مستشرقین کیونکر خاموش رہ سکتے تھے کیونکہ ان کا تو کام ہی یہی ہے کہ جتنا اور جہاں تک ہو سکے اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کیا جائے اور اس پر قسم قسم کے الزامات تراش کر اس کو بدنام کیا جائے چنانچہ انہوں نے یہاں بھی یہ الزام لگایا کہ اسلام ایک خونخوار مذہب اور اپنے پیروکاروں کو خون ریزی کی تعلیم دیتا ہے اور جہاں پھیلا ہے تلوار اور زبردستی سے پھیلا ہے اپنی خوبیوں اور ذاتی محاسن کی وجہ سے نہیں پھیلا چنانچہ امریکہ کے مشہور مصنف وادیب واشنگٹن ارونگ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح عمری پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کے شروع میں اس نے آپؐ کی فرضی تصویر رکھی ہے اور اس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار ہے۔[۲]

ہالینڈ کا مشہور مستشرق پروفیسر لکھتا ہے۔

"محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے زمانے میں مسلمانوں کی تلوار کا خوف دُور دُور تک پھیل گیا اور اسی خوف کے نتیجے میں لوگ مجبور ہو کر نیا دین اختیار کرنے لگے۔"

ان غلط بیانات و تحریرات سے متاثر ہو کر گاندھی جو ہندو قوم میں سب سے بڑے صائب الرائے آدمی سمجھے جاتے ہیں بار بار اس خیال کا اظہار کیا کہ "اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا جس کے فیصلہ کی طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے"۔[۳]

جواب ۱:- مخالفین اسلام کا یہ الزام صداقت اور راست بازی سے خالی تعصب اور عناد سے پر، انصاف اور حق پرستی سے بالکل بعید ہے۔ مستشرقین نے اپنی عادت کے مطابق دیدہ و دانستہ حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے کیونکہ اسلام میں قطعاً یہ اجازت نہیں ہے کہ کسی غیر مسلم کو تلوار کے زور سے زبردستی با اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے اس لئے کہ ایمان ایک اختیاری امر ہے جس کا تعلق

---

[۱] بخاری کتاب التفسیر سورۃ طور [۲] تحقیق جہاد ص۱ از مولوی چراغ علی اشاعت اسلام ص۳۵۷ از محمد اسمٰعیل پانی پتی [۳] الجہاد فی الاسلام ص۱۱ از مولانا مودودی

دل سے ہے اور دل میں کوئی چیز اس وقت تک اثر نہیں کرتی جب تک وہ رضا اور خوشی سے نہ آئی ہو اس حقیقت کی صداقت پر قرآن و حدیث اور تاریخ اسلام کا ورق ورق شاہد ہے۔ چنانچہ سورۃ بقرہ میں ہے۔

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ

دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں۔ بیشک ہدایت گمراہی سے جدا ہو چکی ہے۔ اب جو کوئی کرتے والوں کو نہ مانتے اور اللہ پر یقین لادے تو اس نے مضبوط حلقہ کو پکڑ لیا جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے

مشہور مفسر قرآن حافظ عماد الدین ابن کثیر نے اسی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"کسی شخص کو دین اسلام میں داخل ہونے پر مجبور نہ کرو کیونکہ اس دین کے دلائل و براہین اس قدر واضح اور روشن ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے کسی شخص کو اس میں داخل ہونے پر مجبور کرنے کی ضرورت نہیں ہے"[۵۱]

اسی طرح صاحب کشاف اور امام فخرالدین رازی نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسلام میں زبردستی قطعاً ممنوع ہے۔

جواب ۲: جب ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو مخالفین کا یہ الزام کہ اسلام زبردستی اور تلوار کے زور سے پھیلا ہے خلاف واقع پاتے ہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا دور تئیس (۲۳) سال ہے اس دور میں سے آپ کی تیرہ سالہ مکی زندگی میں کسی پر زبردستی اسلام قبول کرنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں کیونکہ اس وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حالت ظاہری طاقت کے اعتبار سے بہت کمزور تھی۔ بلکہ اس وقت تو کسی کا مسلمان ہونا گویا تمام اہل عرب کی عداوت اور دشمنی کا مول لینا تھا ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں آپ کسی پر کس طرح جبر کر سکتے تھے۔

مدنی زندگی میں آپؐ کو بلاشبہ سیادت و حکومت ملی مگر اس دس سال کے عرصہ میں ایک آدمی بھی ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا جسکو اسلام کرنے کے لئے آپؐ نے مجبور کیا ہو بلکہ اس دور میں متعدد واقعات ایسے پیش آئے کہ آپؐ بڑی آسانی سے لوگوں کو اسلام لانے پر مجبور کر سکتے تھے۔ مگر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی اس کا خیال تک بھی نہیں کیا چنانچہ جنگ بدر کے موقع پر کفار کے ستر (۷۰) آدمیوں میں سے کسی ایک کو بھی اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا گیا بلکہ بعض لوگ جو امیر تھے ان سے فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا بعض کو اس وعدہ پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ آئندہ مسلمانوں کے خلاف فتنہ پردازی نہیں کریں گے اور بعض کو اس خدمت کے بدلے میں رہا کیا گیا کہ وہ انصار کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں اور بعض کو احساناً چھوڑ دیا گیا۔

اسی طرح غزوہ بنو قریظہ میں کم و بیش دو سو (۲۰۰) یہود گرفتار ہو کر آئے ان میں سے بعض کو فدیہ لیکر چھوڑ دیا اور بعض کو بطور احسان رہا کر دیا۔

---

[۵۱] سورۃ بقرہ رکوع ۳۴ پ ۳ ص ۵۳ تفسیر ابن کثیر ج الخامسۃ آیت لا اکراہ الدین۔

ان کے علاوہ غزوہ بنی مصطلق میں ایک سو نوے (۱۹۰)، سریہ حموم میں دس (۱۰) سریہ عمیص میں (۹)، سریہ حسمی میں ایک (۱۰۰) غزوہ حنین میں چھ ہزار (۶۰۰۰) سریہ عیینہ بن حصین میں باسٹھ (۶۲) اور سریہ قطبہ بن عامر میں بہت سے لوگ گرفتار ہوئے مگر سب کے سب کچھ معاوضہ لئے بغیر چھوڑ دیئے گئے ان میں سے کسی ایک فرد کو بھی اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا گیا۔[۵۱]

جواب ۳ سنہ ۸ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب فاتحانہ انداز میں مکہ میں داخل ہوئے تو آپ نے اسلام کی خوبیوں اور اس کے نظام عدل ومساوات پر ایک نہایت بلیغ خطبہ دیا۔ ان سامعین میں وہ لوگ بھی تھے جو اسلام کے مٹانے میں ایک دوسرے سے سبقت لیتے اور اس کام کو وہ اپنے لئے فخر وسعادت سمجھتے تھے وہ لوگ بھی تھے جن کی زبانیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر گالیوں کی بارش برساتیں اور وہ لوگ بھی تھے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قسم قسم کی تکلیف پہنچا کر اپنی کامیابی پر نازاں ہوتے۔ وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے اسلام قبول کرنے والوں کو تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر ان کے سینوں پر آتشیں مہریں لگایا کرتے تھے۔ اس وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے تو تمام کفار کو مجبوراً مسلمان کر سکتے تھے لیکن اسی وقت برسر منبر اعلان فرمایا۔

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ[۵۲] — تم پر کچھ الزام نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔

جواب ۴ وہ لوگ جو صلح پر آمادہ ہو جاتے ان سے جو معاہدے کئے ان معاہدوں میں واضح کر دیا جاتا تھا کہ ان کے معابد کو کچھ نہ کہا جائے گا۔ انہیں اپنے مذہب کے مطابق رسومات ادا کرنے کی پوری آزادی حاصل ہوگی اور انہیں اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہ کیا جائے گا چنانچہ نجران کے عیسائی جب مدینہ منورہ میں حاضر ہوئے اور صلح کر کے جزیہ دینا قبول کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو عہد نامہ لکھ کر دیا اس میں مسلمانوں کی طرف سے یہ اقرار تھا کہ نصاریٰ کو کسی صورت میں اپنا مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہ کیا جائے گا اور نہ ان سے عشر لیا جائے گا۔[۵۳]

اسی طرح مبلغین کی جماعتیں صرف تبلیغ اسلام کے لئے بھیجی جاتی تھیں لڑائی کے لئے نہیں چنانچہ علامہ طبری لکھتے ہیں۔

قَدْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعَثَ حَوْلَ مَكَّةَ السَّرَايَا تَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَلَمْ يَاْمُرْهُمْ بِقِتَالٍ[۵۴] — آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ کے اطراف میں دعوت اسلام کے لئے سرایا بھیجے اور ان کو لڑائی کا حکم نہیں دیا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جب یمن بھیجا تو خاص ہدایت فرمائی۔

فاذا نزلت بساحتهم فلا تقاتلهم حتى يقاتلوك[۵۵] — جب تم وہاں پہنچ جاؤ تو جب تک تم پر کوئی حملہ نہ کرے تم نہ لڑنا۔

یہ ہے اسلام کا حکم اور یہ ہے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل، کہاں مقررہ ومسلمہ اصول کے بعد بھی کسی مسلمان کو یہ گنجائش رہتی ہے کہ کبھی جبراً مسلمان بنائے۔ اگر کوئی ایسا کرتا تو کیا اس کا یہ فعل شریعت اسلام کے مطابق ہوتا یا ایسا ہی نہ سمجھا

---

۵۱ ملاحظہ ہو رحمۃ للعالمین از قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری صفحہ ۲۴۴ تا ۲۴۶ جلد ۲ ۵۲ سیرۃ النبی صفحہ ۵۲۰ ج ۱ ۵۳ فتوح البلدان صفحہ ۷۵ کتاب الخراج صفحہ ۴۱ ۵۴ سیرۃ النبی صفحہ ۶۰۶ ج ۲ ۵۵ طبقات ابن سعد صفحہ ۱۶۹ ج ۲ مغازی

جائے جیسے دوسرے احکام کی خلاف ورزی۔

سیرت نبوی کا مطالعہ کیا جائے تو اس قسم کے کئی واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے جبر کی قطعاً اجازت نہیں دی۔

سابقہ صفحات میں آپ نے جو کچھ پڑھا ہے یہ صرف رسول اللہ کی زندگی کے متعلق تھا۔ اگر آپ خلفاء راشدین بلکہ آئندہ آنے والے مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو ایک واقعہ بھی ایسا نہ ملے گا جس سے پتہ چلے کہ اسلام میں زبردستی ہے۔ اختصار کے پیش نظر صرف حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت کا واقعہ بطور ثبوت پیش کیا جا رہا ہے۔

طبقات ابن سعد میں ہے کہ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس بات کے شدید مخالف تھے کہ کسی شخص کو جبراً مسلمان کیا جائے۔ چنانچہ وہ اپنے غیر مسلم غلام کو ہمیشہ اسلام کی تلقین کیا کرتے تھے لیکن وہ صاف انکار کر دیتا تھا کہ میں اسلام نہیں لاتا۔ اس کے انکار کو سن کر آپ فرماتے۔

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ — کہ دین میں کوئی زبردستی نہیں۔

حالانکہ حضرت عمر کے عہد خلافت میں اسلام عروج پر تھا۔ اگر آپ ساری دنیا کو جبراً مسلمان کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اسی طرح امور خلافت کے سلسلے میں غیر قوموں سے جو معاہدے کئے جاتے تھے ان میں بھی صاف لکھا ہوا ہوتا تھا کہ رعایا میں سے کسی شخص کو زبردستی مسلمان نہ کیا جائے گا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیت المقدس خود جا کر جو معاہدہ کیا تھا اس میں یہ صاف طور پر لکھا ہوا تھا۔

وَلَا يُكْرَهُونَ عَلَى دِينِهِمْ وَلَا يُضَارُّ أَحَدٌ مِنْهُمْ — ان میں سے کسی آدمی پر مذہب کے بارے میں کسی قسم کا جبر نہ کیا جائے گا اور نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائیگا

جس مذہب میں یہ تعلیمات ہوں اس کے بارے میں کوئی صاحب ہوش و حواس بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مذہب خونخوار مذہب ہے اور تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔

مستشرقین کا اعتراف:۔

متعصب اور اسلام سے عناد رکھنے والے عیسائیوں نے تو حقیقت سے روگردانی کرتے ہوئے اسلام پر زبردستی اور تلوار کے زور سے پھیلنے کا الزام لگایا ہے لیکن غیر متعصب اور اسلام پسند عیسائی مصنفین نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کیا تو انہوں نے عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اسلام جبر

---

۵۱ کنز العمال ص۴۹ ج۵ بحوالہ ابن سعد ۵۳ سیرۃ النبی ص بحوالہ تاریخ طبری

سے نہیں پھیلا بلکہ اپنی صداقت و حقانیت سے پھیلا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر وگلیری لکھتے ہیں کہ:۔

"جو لوگ یہ کہتے ہیں اور جا بجا یہ مشہور کرتے ہیں کہ اسلام جبر و تشدد کا مذہب ہے اور بزورِ شمشیر پھیلا ہے۔ وہ یا تو اندھے ہیں یا جان بوجھ کر دیکھنا نہیں چاہتے۔ ان کی مراد اگر یہ ہے کہ دوسرے بانیانِ مذاہب کے برعکس محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تلوار چلائی اور فوج کشی کی . . . . تو ہمیں کہنا چاہئیے کہ یہ درست ہے لیکن ساتھ ہی خالی الذہن ہو کر یہ بھی سوچنا چاہئیے کہ اس پیش قدمی اور فوج کشی کے اسباب کیا تھے؟ لیکن اگر اس الزام کا منشاء یہ ہے کہ مذہب کو جبراً منوانے کی خاطر ایک تباہ کن جنگ لازمی ہے اور اسلام کی فطرت میں یہ بات داخل تھی کہ غیروں پر زبردستی اپنا تسلط جمائے تو ہم اس الزام کو تردید کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ قرآن کی تعلیم اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کردار دونوں اس امر کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ الزام سراسر جھوٹا ہے۔

سر تھامس آرنلڈ اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام میں لکھتے ہیں۔

"اس بات کا فیصلہ کہ جبر وہ شے نہ تھی جس کی وجہ سے یہ عیسائی مسلمان ہوئے ان آشتی تعلقات سے ہو سکتا ہے جو مسیحی عربوں میں موجود تھے۔ خود رسول اللہ صلی نے چند مسیحی قبائل سے عہد نامے کئے تھے جن میں آپ نے عیسائیوں کی حفاظت کا اور پابندیِ مذہب میں ان کے آزاد رہنے کا ذمہ اور ان کے قسوس کے دیرینہ حقوق و اختیارات کے بحال رہنے کا وعدہ فرمایا تھا"[2]

آگے جاکر اسی کتاب میں لکھتے ہیں۔

"پہلی صدی ہجری کے مسلمان فاتحین اور ان کی نسلوں نے عیسائی عربوں کے ساتھ کیسی بے تعصبی اور دینی مسالمت برتی ان سے یقینی طور پر نتیجہ نکلتا ہے کہ جن مسیحی قبائل نے اسلام قبول کیا انہوں نے اپنی مرضی اور آزاد ارادے سے کیا"[3]

اس بیان سے معلوم ہوا کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا بلکہ اپنی صداقت اور راست بازی کی بناء پر پھیلا ہے۔ اگر اسلام زبردستی سے پھیلا ہوتا تو آج پوری دنیا میں ایک انسان بھی ایسا نہ ہوتا جو غیر مسلم ہو۔

استدراک:۔ اس موقعہ پر دل میں طبعاً یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص کو اسلام میں داخل کرنے کے لئے جبر کی اجازت نہیں تو پھر ان غزوات و سرایا کا مقصد کیا مطلب ہے جو عہدِ نبوی اور خلفائے راشدین کے دور میں وقوع پذیر ہوئے اور تاریخ اسلام ان کی آئینہ دار ہے۔

جواب:۔ اگر اسلامی تاریخ اور ان واقعات کی وجوہ کو دیکھا جائے تو یہ شبہ دور ہو جاتا ہے اس لئے کہ جب ملک میں فتنہ و فساد پھیل جائے۔ بدامنی عام ہو، حقوق انسانیت کی پامالی ہو رہی ہو، مذہبی آزادی مفقود ہو اس وقت مسلمانوں کو اجازت ہے

[1] تاریخ اشاعت اسلام ص۳۵۴، ۳۵۵ بحوالہ اسلام پر ایک نظر ص۱۱ دعوت اسلام ص۴۸ بحوالہ دیبیت المقدس کا عربی سے ترجمہ جے فلاٹز

صفحہ ۹۶۸، ۱۹۷۰ طبوعہ لندن ۱۸۳۶ء [2] دعوت اسلام ترجمہ پریچنگ آف اسلام ص۵۲ [3] ایضاً ص۵۲

کہ وہ جہاد کے ذریعہ فتنہ وفساد کو ختم کرے، بدامنی کو دور کریں، حقوق انسانیت بحال کر کے مذہبی آزادی بحال کریں عدل وانصاف قائم کر کے عوام کے لئے زندگی پرامن کر دیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ (سورہ بقرہ ۵) اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ (ترجمہ شیخ الہند)

بعض جنگیں وہ ہیں جو محض دفاع کے لئے لڑی گئیں۔ اور پھر اس دفاع کی مختلف صورتیں ہیں۔

۱۔ جب کفار مسلمانوں پر قسم قسم کے ظلم ڈھانے شروع کر دیں۔ انسانی حقوق کو پامال کریں مسلمانوں کی ایمان وضمیر کی آزادی سلب کر لیں اور انہیں اپنے مذہب کے مطابق زندگی بسر کرنے سے روک دیں تو اس وقت مسلمان پوری قوت اور طاقت کیساتھ ان کے ظلم کو دفع کریں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ

جو لوگ تم سے لڑتے ہیں ان سے خدا کی راہ میں لڑو مگر لڑنے میں حد سے تجاوز نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ

ان لوگوں کو لڑائی کا حکم ہوا جن سے کافر لڑتے ہیں اس واسطے کہ ان پر ظلم ہوا اور اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے (ترجمہ شیخ الہند)

۲۔ جن کفار نے راہ حق میں رکاوٹیں پیدا کر رکھی ہوں تو ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے کفار کے خلاف جہاد کرنے کی اجازت دی گئی ہے چنانچہ قرآن عزیز میں ہے

الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ أَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ . . . . فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰى إِذَا أَثْخَنْتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا

جو لوگ کہ منکر ہوئے اور روکا اوروں کو اللہ کی راہ سے اللہ نے ان کے کام کھو دیئے۔ ۔ ۔ ۔ سو جب تم منکروں کے مقابل ہو تو (ان کی) گردنیں مارو یہاں تک کہ جب خوب قتل کر چکے تو ان کو مضبوط قید (میں) باندھ لو پھر یا احسان کیجئو اور یا معاوضہ لیجئو۔ یہاں تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔ (از شیخ الہندؒ)

جب کوئی قوم عہد نامہ توڑ دے تو ان کے خلاف طاقت استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

الَّذِينَ عَاهَدْتَ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُونَ عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ

جن سے آپ نے معاہدہ ہے ان میں سے وہ ہر بار اپنا عہد توڑتے ہیں اور وہ ڈر نہیں رکھتے سو اگر

لے سورۃ محمد ۶۱ پ ۲۶ ۵/۶

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ یَذَّکَّرُوْنَ (انفال پ ۹)

ان کو کبھی لڑائی میں پاویں تو ان کو ایسی سزا دو کہ ان کو دیکھ کر ان کے پچھلے بھاگ جائیں تاکہ عبرت ہو۔

۴۔ جب مسلمانوں کی ایک کمزور جماعت کفار کے ظلم وستم کا شکار بنی ہوئی ہو تو اس وقت دوسرے مسلمان جو آزاد ہوں اور جنگ کی قوت رکھتے ہوں ان پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے اس جماعت کو کفار کے ظلم سے نجات دلانے کے لئے جنگ کریں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَمَا لَکُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا (النساء پ ۵)

اور تم کو کیا ہوا کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان کے واسطے جو مرد، عورتیں اور بچے مغلوب ہیں نہیں لڑتے۔ جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم کو اس بستی سے نکال کہ یہاں کے لوگ ظالم ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی عقلمند اس قسم کی لڑائیوں کو خلاف عقل قرار نہیں دے گا ثابت ہوا کہ اشاعت اسلام کے بارے میں کسی قسم کی زبردستی اور جبر نہیں ہے۔